تلاش غالب

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے ۱۳
غیر مطبوعہ خطوط، نو دریافت غیر مطبوعہ کلام
اور فکر و فن پر تحقیقی مضامین کا مجموعہ

نثار احمد فاروقی

یہ کتاب مکمل نہیں۔
صرف صفحہ ۲۳۳ تا ۲٦٤ تک ہے۔
جو کہ دراصل ایک مضمون اٹھایا گیا ہے

طبع اوّل: مئی ۱۹۶۹ء
مطبع: کوہ نور پریس، دہلی

ناشر:
ظلّ عباس عباسی

قیمت

۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ دلّی ۶

فہرست

"غالب کے طرفدار"

لطیف الزماں خاں کے نام

کہ آشنا سخن آشنا نگہدارد

کلامِ غالب کا ایک ہم عصر شارح
درگا پرشاد نادر دہلوی

شعرائے اردو میں بشمول علامہ اقبال، کسی شاعر کے کلام کی اتنی شرحیں نہیں لکھی گئیں جتنی غالب کے اردو دیوان کی لکھی گئی ہیں۔ ان کے عہد سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ کلامِ غالب کے سب سے پہلے شارح تو خود مرزا ہی ہیں، جنھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو وقتاً فوقتاً اپنے اشعار کے معانی اور مطالب خود لکھ کر بھیجے ہیں اور یہ ان کے خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے دیوان غالب نسخۂ عرشی کے حواشی میں ایسی تقریباً کل عبارتیں فراہم کر دی ہیں جو غالب نے اپنے ہی شعروں کی تفسیر و تاویل کے سلسلے میں لکھی تھیں۔

غالب کے ہم عصروں میں اُن کے کلام کی شرح جزوی طور پر مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء) نے بھی لکھی ہے۔ یعنی یادگارِ غالب میں جہاں انھوں نے کلامِ غالب کی لفظی و معنوی خوبیوں اور خصوصیتوں سے بحث کی ہے وہاں مثال میں اُن کے اشعار پیش کیے ہیں، اور ان اشعار کی دروبست یا معنوی نزاکت کو بہت دل نشین پیرائے میں سمجھایا ہے۔ بعض اشعار کا وہ مفہوم جو آج سمجھا جاتا ہے سب سے پہلے مولانا حالی ہی نے بیان کیا تھا۔ مثلاً

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حالی نے اس کے بیان کی خوبی اور ندرت کی طرف اشارہ کر دیا ہے تو اب خواہ

ہر شخص اسے سمجھتا ہے اور سامنے کی بات کہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر حالی اس شعر کی وضاحت نہ کرتے تو شاید ہی کسی کا ذہن اُدھر منتقل ہوتا، یعنی دوسرے مصرعے میں لفظ "مکرر" شعر کے معنوں کی کلید ہے کہ پہلا مصرع ایک بار بطور صلائے عام پڑھا جائے اور اسی کو دوبارہ اعتراف کے طور پر پڑھیں کہ فی الواقع کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کی اور بھی مثالیں ہیں جنھیں مولانا حالی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ غالب کے فن کی عظمت کا گہرا نقش دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ مولانا حالی کے بیان کردہ مطالب کو پڑھ کر ہی عام طور پر یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ غالب کا کلام شرح و تفسیر کا محتاج ہے اور پھر مختلف شارحین نے بقدرِ حوصلہ اس کی معنوی تہوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔

غالب کے دوسرے ہم عصر شارح خواجہ قمر الدین راقم (۱۸۳۲ء - ۱۹۱۰ء) ہیں۔ انھوں نے بھی دیوان غالب کی ایک شرح لکھی تھی، لیکن یہ اب دستیاب نہیں ہوتی[1]۔ تیسری معاصر شخصیت درگا پرشاد نادر دہلوی کی[2] ہے جسے اس مضمون میں پہلی بار شارحِ کلام غالب کی حیثیت سے روشناس کرایا جارہا ہے۔ غالب کی وفات کے بعد دیوان غالب کی شرحیں مختلف مدارج کی لکھی گئیں۔ کچھ علمی انداز کی، کچھ درس و تدریس کے مقصد کو پورا کرنے والی اور بعض محض چربہ اور نری نقالی۔ پھر ان کی دو حیثیتیں ہیں بعض شارحین کا مقصد ہی کلام غالب کی شرح لکھنا تھا۔ انھوں نے دیوان غالب کے آغاز سے اختتام تک ہر شعر کا مطلب بیان کیا اور وضاحت کی خواہ وہ شعر صاف اور سہل ہی کیوں نہ ہو۔ بعض نے ضمناً اور جزوی شرح لکھی اور ان کا مقصد یا تو محض مشکل اشعار کا مطلب بیان کرنا تھا یا غالب کے فکر و فن کا جائزہ پیش کرنا تھا۔ اس ضمن میں جن شارحین کے نام لیے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں:

---

[1] راقم کے حالات کے لیے رجوع کریں: احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۲۹۰ - ۲۹۳

[2] نادر دہلوی کے حالات کے لیے: دہلی کالج میگزین (دلی نمبر) ۱۹۵۹ء ص ۲۷۷ - ۲۸۳

احمد حسین شوکت میرٹھی، علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، بے خود موہانی، بے خود دہلوی، عبدالباری آسی، جوش ملسیانی، آغا محمد باقر، نیاز فتح پوری، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا سہا مجددی، اثر لکھنوی وغیرہ۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی تفہیم غالب کے عنوان سے اشعار غالب کی شرح لکھ رہے ہیں جو رسالہ شب خون الٰہ آباد میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے اور ڈاکٹر گیان چند نے دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ کی شرح لکھ لی ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

(۲)

کلام غالب کی جزوی شرح کرنے والوں میں مرزا غالب کے ہم عصر منشی درگا پرشاد نادر دہلوی بھی ہیں۔ یہ کپل منی کی اولاد گیلش گوت کے برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پردادا منشی ہردے رام بھی شاعر تھے، دادا منشی نامپت رائے اور والد منشی منسارام ناتواں بھی شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔ اصل وطن سرہند تھا لیکن نادر شاہ کے حملے میں وہاں سے اجڑ کر دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ یہیں ۱۲ جمادی الاول ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۸۴۳ء کو بدھ کے دن درگا پرشاد پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں منشی ذکاء اللہ، مولانا امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر دہلوی سے تعلیم حاصل کی اور ۱۸۵۷ء کے واقعات سے قبل ہی ضلع رہتک میں محرر کے پاس ہو گئے۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۳ء تک ضلع گوڑگانواں میں فارسی کے مدرس رہے اور ۱۸۶۴ء میں دہلی کے محلہ نیلی واڑہ کے اسکول میں تبادلہ ہو کر آ گئے۔ فروری ۱۸۷۷ء میں انھوں نے شادی کی اور اسی سال اپریل میں لاہور چلے گئے۔

پنڈت درگا پرشاد نادر دہلی سوسائٹی کے بھی ممبر تھے اور منشی پیارے لال آشوب... کی فرمائش سے انھوں نے شعرائے دکن کا تذکرہ خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم تیار کیا تھا جو مطبع مفید عام لاہور سے طبع ہوا۔ نادر کی دوسری تصانیف میں تذکرۃ النسائے نادری عرف چمن نادر بھی ہے جس میں ۴۴ شاعرات کا حال اور کلام درج ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۸۴ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔ نادر کے بیشتر مسودات ۱۸۵۷ء

کے ہنگامے میں غتر بود ہو گئے۔ بعد کو ایک مختصر دیوان نظم مطلب غریب (=۱۲۹۳ھ) فراہم کر لیا تھا۔

نادر ہی کی ایک تصنیف کا مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کے ذخیرے میں ہے جس کے ابتدائی دو صفحات اور سرورق غائب ہے، آخر سے بھی کچھ ورق ضائع ہو گئے ہیں۔ بظاہر اس کتاب کا نام چار چمن ہے اور اس کی یہ ترتیب ہے:

پہلا چمن: شعر کی خوبی اور شعر فہمی میں شعراء کی فضیلت اور غرض۔ اس میں اقسام شعر کے تحت لکھا ہے:

اوّل قسم : عارفانہ	دوسری قسم : عاشقانہ
تیسری قسم : نصیحتانہ	چوتھی قسم : شاعرانہ

ان میں سے ہر قسم کی مثالیں اساتذہ کے کلام سے فراہم کی گئی ہیں اور ان اشعار کے بین السطور میں یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ کون سی قسم کے شعر ہیں۔ پہلا چمن صفحہ ۳۶ پر تمام ہو جاتا ہے۔ آخر میں تاریخ تالیف خزینۃ العلوم مصنّفہ لالہ درگا پرشاد نادر دہلوی میر مقصود علی رافع کی ہے:

لکھا نادر یہ تذکرہ نادر — اب یہ حاسد کو چاہیئے غم سے
قلب رنجور رافعا زخمی — دگنا اور تگنا چوگنا کرے

حاشیے پر بتایا ہے کہ قلب بمعنی دل، لفظ رنجور کا دل یا قلب ج ہے۔ اس کو ترتیب وار اس کے ۳ کے ہندسے کو دگنا کیا تو ۶ ہوے اور تگنا کیا تو ۹ بنے اور تین کو چوگنا کیا تو ۱۲ ہوئے یہ صنعت ریاضی جمع و ضربیہ ہے۔

دوسری تاریخ کا عنوان یہ ہے:

"تاریخ کتاب ہذا بطور اختصار قطعہ مندرجہ کتاب ہذا صفحہ ۲۵۱ حلم مولف شاگرد مصنّف موصوف"

اس قطعہ تاریخ میں ۵ شعر ہیں جن میں آخری دو یہ ہیں:

شوق تھا یہ شاعری میں کون سی سیکھوں کتاب
جس سے آجائیں مجھے اس علم کے طرز و رسوم
عیسوی مصرع میں ہجری کہہ صلاح ہاتف نے دی
حسلم چو چند جی لگا کر پڑھ خزینۃ العلوم (۱۲۹۶ھ)

اس کی تشریح حاشیے پر یوں کی گئی ہے: "ہاتف نے جو صلاح دی کہ عیسوی مصرع میں ہجری کہہ اس سے ثابت ہے کہ کل مصرع عیسوی سنہ کا ہے جس کے حرفوں سے ۱۸۷۹ء نکلے۔ اس مصرع کے اندر ہجری سنہ اس طرح کہے کہ خزینۃ العلوم پر جس کے حرفوں سے ۱۲۴۴ھ نکلتے ہیں چو چند جی لگایا۔ جی کے ۱۳ ہیں اس کا چو چند ۵۲ ہوئے ۵۲ کو ۱۲۴۴ھ پر لگانے سے ۱۲۹۶ھ ہو گئے۔ اس کو صنعت حسابیہ کہتے ہیں۔"

اس کے بعد "پہلے چمن کا حل" پیش کیا ہے اور گذشتہ ابواب میں جو اشعار مثالوں میں آتے ہیں ان کے معانی و مطالب بیان ہوئے ہیں۔ یہ ۴۹ صفحوں کو محیط ہیں۔

دوسرا چمن: اشعار محاورات میں ہے۔ یہ ۲۷ صفحوں پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی اس کے اشعار کا حل ۵ صفحوں میں ہے۔

تیسرا چمن: ضرب الامثال میں ہے۔ اس کے تحت ضرب الامثال اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ ہمارے نسخے میں یہ صرف س تک ہے۔ اس حصے میں اشعار نہیں ہیں۔

(۳)

اس کتاب کے پہلے اور دوسرے چمن میں غالب کے جو اشعار پیش ہوتے ہیں اور ان کا مطلب بیان کیا گیا ہے وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہاں حاشیوں پر وہ عبارت دی گئی ہے جو ان اشعار کے حواشی میں درج ہے اور اشعار کے نیچے وہ مطلب لکھا گیا ہے جو شرح ابیات کے تحت علیحدہ حصے میں بیان ہوا ہے:

اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی

ان کے اشعار اس وجہ سے ادق ہوتے ہیں کہ بہت سے قابل ذکر الفاظ کو محذوف کرتے ہیں۔ بعیدہ قرینہ و اشارہ و ایما پر مدار رکھتے ہیں:

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا[1]

پہلے زمانے میں دستور تھا کہ جس کو عدالت ماتحت کا اپیل کرنا ہوتا تھا وہ عدالت ماتحت کی نقل حکم اپنے جامے پر ٹانک کر عدالت عالیہ کے سامنے جا کھڑا ہوتا تھا۔ یہ فریادی کی نشانی تھی۔ اس کو لباس فریاد کہتے ہیں۔ غالب نے وہی رواج اب ذکر کیا ہے۔ تصویر جو کاغذ پر کھینچی ہوتی ہے تو یہ کاغذ گویا اس کا لباس فریاد ہے اور فریاد اس امر کی ہے کہ مصور نے مجھے لوٹ لیا کہ میری گویائی، بینائی، رفتار اور تمام قدرتی اسباب چھین کر بے زبان اور بے حرکت بنا کر اصلی صورت بگاڑ کر اس کاغذ میں قید کر دیا۔ اس میں معرفت و تعریف خدا یہ ہے کہ انسان کا اعلےٰ سے اعلےٰ درجے کا کمال اور صنعت صانع حقیقی کے مقابلے میں کمال عیب اور نقص ہے۔ حالانکہ اپنی دانست اور ظاہری خیال سے مصور تصویر کو اصلی صورت سے عمدہ نقش کرتا ہے۔ مگر قدرتی اسباب مثلاً گویائی، بینائی، رفتار، نزاکت نہ ہونے سے اصلی صورت بالکل بگڑ گئی۔ مصور کو جو گمان تھا کہ تصویر میری تعریف کرے گی اس لیے درحقیقت تصویر اس کی فریاد کرتی ہے کہ گستاخی کی۔

۲۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا (دیوان / ۱۰)

یہ طب کا مسئلہ ہے کہ جب رگوں میں ہوا ابھر جاتی ہے تو خون میں بلبلے ہو جاتے ہیں۔ اس کو ریح کی بیماری کہتے ہیں۔ قطرے کو یہ درد ریح ہو کر یعنی ہوا ابھر کر بلبلہ بن گیا۔ بلبلے کی ہوا جب تک بلبلے کی حد میں رہے تب تک یہ ہوا کا درد درمیان ہے اور جب یہ ہوا حد سے بڑھی یعنی پھیل کر باہر کو سر نکالا پس اسی دم درمیان سے نکلی اور درد کو

---

[1] دیوان غالب / ۱۳ (مرتبہ مالک رام، شائع کردہ آزاد کتاب گھر دہلی) آئندہ تمام اشعار میں اسی دیوان کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

آرام ہوا اس لیے درد ہی کا حد سے نکل جانا قدرتی دوا ہے۔ ہوا نکلنا یعنی مرجانا ہے۔ بلبلے کے واسطے فنا ہونا عشرت ہے کہ دریا میں مل کر دریا بن گیا۔ بقول ذوق:

کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

مراد یہ ہے کہ عارف فنا ہو کر خدا کی ذات میں مل کر خدا ہو جاتا ہے۔ فنا ہونے کی تکلیف کا انجام اس کے لیے راحت ہے اس کی تاکید میں انھیں کا یہ شعر ہے:

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے (دیوان/۱۹۵)

۳- نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (دیوان/۹۷)

اوّل بھی خدا ہے، آخر بھی خدا ہے، جسم انسان کی ہستی بیچ میں حائل ہو گئی، اگر یہ وجود انسانی نہ ہوتا تو میں خدا ہوتا۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا (دیوان/۵۸)

ذوق کے پہلے شعر[1] اور اس شعر کا ایک مضمون ہے۔ پہلے اس کی شرح دیکھو پھر اس کو۔ اپنا جلوہ انسان کو دکھانے کے واسطے پہلے اس میں آپ بینائی بنا، اگر وہ آپ ہی بینائی نہ

---

[1] ذوق: آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف ورنہ یاں کون تھا جو ترے مقابل ہوتا

اس لیے ہر آئینہ میں تیرا ہی عکس ہے یعنی تو ہی ہے۔ جب ہر شے میں تو ہے اس قوت کے باعث کہ تو اپنی تجلی سہارنے کے واسطے اس میں موجود ہے آئینہ ہستی تیری تاب نہ لاسکا اگر اس میں تو نہ ہوتا تو آئینہ ہستی کی کیا ہستی تھی جو تیری تجلی کی تاب لا سکتا۔ ذرا سی تجلی کوہ طور پہ پڑی تھی وہ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ عارف جو تجھے دیکھ لیتا ہے پہلے اس میں تو سمایا ہوا ہے۔ اس وجہ سے عارف تجھے نہیں دیکھ سکتا بلکہ تو ہی اس کے نام سے اپنی ذات آپ دیکھ رہا ہے جیسے کہ ناسخ فرماتے ہیں:

آئینہ یہ دوراں ہے اس میں عکس جاناں ہے آپ اپنا حیراں ہے آپ ہی اپنا ثانی ہے

جنتا تو پھر دیکھنے کی کس کو تاب تھی پس وہ بینائی بن کر ہر ایک میں ہے جیساکہ قرآن شریف میں فرمایا کہ نَحْنُ فِی اَنْفُسِکُمْ یعنی ہم تمہارے نفسوں میں ہیں۔ دوسری آیت یہ ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ یعنی ہم تمہاری شاہ رگ سے بھی نزدیک ہیں، اس میں دوئی کی بو نہیں، یعنی وہ اپنے سوا کسی دوسرے کی نظر نہیں پڑتا، انسان کو جو دکھائی دیتا ہے اس وقت دیتا ہے جب اس کی انسانی ہستی کو مٹا کر آپ بن جاتا ہے۔ جب دیکھنے دکھانے والا آپ ہی آپ ہے تو دوئی کا کیا ذکر ہے۔ اگر وہ دوئی پسند ہوتا تو ضرور کبھی نہ کبھی کسی کو اس کی اصلی حالت انسانی میں ملتا چوں کہ وہ انسان کو اس کی ہستی مٹا کر آپ بنے بدون کبھی دکھائی نہیں دیا اس وجہ سے وہ سب میں یگانہ ہے دوئی کی اس میں بو نہیں۔ مولف نے درویشی نور سے مختصر طور پر اس عقدے کو کھولا ہے ورنہ یہ تصوف کا ایسا باریک مسئلہ ہے کہ خود غالب اس کے بیان پر آگے کے شعر میں فخر کرتا ہے:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا (دیوان/۵۸)

۵۔ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (دیوان/۵۰)

حجاب یہاں دو معنی دیتا ہے۔ ایک چھپانے کا پردہ، دوسرے ساز کا پردہ۔ نوا معنی گانے کی آواز۔ یہ شعر ذوق کے دوسرے شعر کے مضمون کے موافق ہے[1]۔ ذوق نے برگ سے

---

[1] ذوق: گوش شنوا نہیں ہے باغ جہاں میں غافل ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

اے غافل تجھ کو معرفت کے کان نہیں ورنہ ہر ایک پتّا اس کی تعریف گاتا ہے۔ پتّے سے مراد ہر شے۔ آدمیوں کی عبادت تو ظاہر ہے، پہاڑوں کا اس کے عشق میں یہ حال ہے، رونے سے دریا جاری ہیں دل میں آگ بھری ہوئی ہے، درخت اس کی نماز میں کھڑے ہیں، پتوں سے جو آواز آتی ہے وہ ذکر و تسبیح کرتے ہیں۔ چوپائے رکوع میں ہیں، زمین کے کیڑے سجدے میں ہیں (پرندے) اس کی یاد گاتے ہیں چناں چہ قمری کہتی ہے حق سرّہ، فاختہ کہتی ہے حق ہو، تیتر کہتا ہے سبحان تیری قدرت چڑیاں بے چوں بے چوں کرتی ہیں بقول نظیر
شام سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں چوں چل چل چل چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

ہر شے مرادلی ہے۔ انھوں نے پردے سے حجاب یا پردہ ستار و طنبورا و سارنگی وغیرہ کے تاروں کو کہتے ہیں جو اوپر ہی ہوتے ہیں۔ جب یہ بجتی ہے تو تمام اندرونی حالات آوازوں اور نغموں کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اسی طرح جتنے بھید خدا تعالےٰ نے مخلوقات کے پردے میں چھپائے ہیں وہ پردے میں ظاہرا خود بخود زبانِ حال سے اپنے اندرونی حالات بآواز بتا رہے ہیں۔ دیکھو ذوق کے دوسرے شعر کی شرح۔ دوسرے یہ ہے جیسے کہ ساز کے مثلاً سارنگی کے بہت سے پردے ہوتے ہیں' ناواقف کو ان میں اکثر فضول نظر آتے ہیں مگر ساز والے کے نزدیک اگر ایک تار بھی کم ہو جائے تو سلسلے میں فرق آ جائے دیکھو حیوانات کا سلسلہ ہاتھی سے لے کر اس کیڑے تک جو پتھر میں ہیں اور بذریعہ خردبین کے نظر آتے ہیں اور نباتات کا سلسلہ کلاں درخت مثلاً بڑ کے درخت سے لے کر اس کائی تک ہے جو پتھر میں سے نکل کر پتھر پر جم جاتی ہے جس کے سبب پاؤں رپٹتا ہے' یا چونے والے فرش پر اور دیواروں پر ہوتی ہے جس سے سیاہی آ جاتی ہے اسی طرح اجرام فلکیہ کا جس کو نظامِ شمسی کہتے ہیں۔ اگر ایک ستارا کم ہو جائے تو کشش اور گردش کا انتظام بگڑ کر سب ایک جگہ غٹ پٹ ہو جاویں' وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ سب کے سب زبانِ حال سے اس کی تعریف گاتے ہیں کہ ہم کو اس نے کمالِ صنعت اور حکمت سے اس اس فائدے کے واسطے پیدا کیا ہے۔ بقول نظامی ؎

دریں پردہ یک رشتہ بے کار نیست
سر رشتہ بر ما پدید از نیست

۶۔ یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا (دیوان/۲۶)

جادہ بمعنی رستہ۔ لالہ کا داغ سیاہ ہوتا ہے جس کو اندھیرا جانا گیا ہے' اس اندھیرے کی روشنی کے واسطے جو اس میں پتیاں ہیں وہ گویا روشن شمعیں ہیں' اسی طرح باغ گل لالہ کے مشابہ ہے۔ باغ میں تمام زمین سرسبز ہوتی ہے صرف روشیں یعنی راستے سبزی سے محروم ہیں مگر باغ میں جتنے راستے ہیں وہ باغ میں ایسے خوشنما اور روشن ہیں جیسے کہ لالہ کے

اندر نفتیلے۔ اس وجہ سے باغ میں زمین کا ایک ذرّہ بھی بیکار نہیں۔ مراد یہ کہ جہاں کا ایک ذرّہ بھی بیکار نہیں، جیسا کہ اُوپر کے شعر میں گزرا۔

۷۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (دیوان/۱۳۶)

بموجب قول فلاسفہ کے کُلُّ شَیئٍ یَرجِعُ اِلیٰ اَصلِہٖ۔ اس لیے تمام چیزوں کی مٹی بن جاتی ہے اور پھر وہ مٹی پہلی صورت پر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ چوں کہ حسینوں کو لالہ و گل سے تشبیہ ہے پس حسینوں کی مٹی نے کوشش کرکے گل اور لالہ کے روپ میں ظہور پکڑا۔ یعنی جو خوب صورت چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں وہ خوب صورتوں کی خاک سے وجود میں آتی ہے جیسا کہ ناسخ فرماتے ہیں:

باغ میں گلبن ہیں گلدستے مزاروں کے تمام
خاک میں کیا کیا ہی گل رخسار پنہاں ہو گئے

یعنی باغ میں جتنے پھولوں کے بوٹے ہیں سب خوب صورت مُردوں کی مٹی سے اٹھ کر قبروں کے گلدستے بن گئے ہیں۔

۸۔ شوقؔ ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا (دیوان/۴۴)

پردۂ تصویر یا مرقع وہ چادر ہوتی ہے جس میں بہت سی تصویریں ہوتی ہیں ان میں لیلے مجنوں کی بھی تصویر ہوتی ہے۔ سب تصویروں کو قسم قسم کے رنگوں سے لباس اور زیور سے سجایا ہوا ہوتا ہے، لیکن مجنوں کی تصویر سوکھی کٹری پھنسلیاں (کذا) نکلی ہوئیں، لاغر اور ناتواں اور ننگی ہوتی ہے۔ اس واسطے لکھا ہے کہ ہر رنگ کا شوق سر و ساماں کا دشمن نکلا۔ مجنوں کو جو تصویر کے رنگ میں لیلے کے دیکھنے کا شوق ہوا تو جیسا کہ زندگی میں دیوانگی سے کپڑے پھاڑ کر ننگا رہتا تھا تصویر میں بھی شوق نے ننگا ہی رکھا۔

۹۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا (دیوان/۵۷)

ؔ ہر رنگ میں یار کے دیکھنے کا شوق۔ رقیب یعنی دشمن۔

جب تک انسان زندہ یا اپنی ہستی اور ہوش و حواس میں ہے تب تک وصال یار یعنی خدا کی ذات میں ملنا ناممکن ہے۔ اگر قیامت تک اس انتظار میں جیتے رہیں تو انتظار کا عذاب ہی ہے مگر ذات میں ملنا مرنے یا فنا ہونے بدون ممکن نہیں، بقول مست سے

خود فنا ہو کے ذات میں ملنا   یہ تماشا حباب میں دیکھا

۱۰۔ ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا (دیوان/ ۵۸)

قاعدہ ہے کہ جیتے جی آدمی کی قدر اور شہرت نہیں ہوتی، مرنے کے بعد جو جنازہ اٹھا تو کوچہ و بازار میں انگلیاں اٹھتی چلی گئیں کہ یہ فلاں عاشق کا جنازہ جارہا ہے۔ اور تمام جگہ شہرت پھیل گیا کہ فلاں عاشق مرگیا اور پھر قبر نے مشہور کیا کہ یہ فلاں عاشق کی قبر ہے۔ اگر دریا میں غرق ہوجاتا تو نہ جنازہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی اور نہ کہیں قبر بنتی۔ سب طرح کی رسوائیوں سے بچ جاتے۔ مطلب یہ کہ عاشقانِ خدا مرکر زیادہ شہرت پاتے ہیں اور ہمیشہ تک مشہور اور زندۂ جاوید رہتے ہیں جیسا کہ ذوق کے پانچویں شعر میں ہے[1]

۱۱۔ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا (دیوان/ ۴۳)

میں نے ابھی کچھ بھی گناہ نہ کیے تھے کہ گناہ ختم ہو چلے۔ گناہ کرنے کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ مذاق یہ کہ شریعت والے گناہوں کو بہت برا بتاتے ہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے بلکہ خدا کا دریائے مغفرت بہت بڑا ہے اور عاشق لوگ بہت گناہوں کو اس واسطے دوست رکھتے ہیں کہ ایک تو گناہ گار کو خدا سامنے بلا کر پوچھے گا، تو اس بہانے سے خدا کا جمال دیکھیں گے۔ دوسرے بخشش کے قابل بھی گناہ گار ہی ہے:

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گار انند

---

[1] جن کی نظر چڑھا ترا رخسار آتشیں   ان کا چراغ گور نہ تا حشر گل ہوا

۱۲- ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر (دیوان/۹۲)

شراب سے حسن زیادہ آب و تاب پر بڑھ جاتا ہے جو عاشق کو زیادہ قتل کرتا ہے چوں کہ یہ تیز تلوار صراحی ہی سے نکلی اس لیے عاشقوں کا خون صراحی کی گردن پر پڑا، یعنی وہی معاونِ قتل ہوئی۔ اس خوف سے صراحی سے آتی ہوئی شراب کی موج تھرتھراتی ہے کہ جس طرح رنگ کی مشابہت ہیں صراحی پکڑی گئی کبھی ایسا نہ ہو کہ حسن کی رفتار کی مشابہت سے ہم پکڑی جاویں کیوں کہ جس طرح اس کا رنگ قتل کرتا ہے اسی طرح اس کی رفتار کرتی ہے حسن کی رفتار کو موجِ شراب سے تشبیہ ہے۔ خدا کا ہر رنگ اور ہر چال دیکھ کر عشق دورے مارتا ہے۔

۱۳- ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں (دیوان/۱۳۹)

اگر دوست کا ملنا مشکل کے ساتھ ہو تو آسان بات ہے کیوں کہ ہے تو سہی مشکل تو وہ بات ہے کہ مشکلوں سے بھی ملنا نصیب نہ ہو یعنی ناممکن ہو۔ طالبوں کے واسطے شے کی طلب میں ہر ایک مشکل بہت آسان ہے۔ وہ تو مشکل اس بات کو جانتے ہیں کہ مشکلیں جھیل کے بھی مطلوب نہ ملے۔ یعنی ملنا ناممکن ہے۔

۱۴- سچ کہتے ہو خودبین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے (دیوان/۲۲۱)

جب آئینہ سامنے ہوتا ہے تو اپنا آپ نظر آتا ہے تو وہ آئینہ دیکھنے والا خود بیں ہوتا ہے یعنی اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ چوں کہ آئینے جیسی پیشانی والا بت یعنی خدا عاشقوں کے سامنے ہے اور اس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ کر مست ہیں اس مستی کو شریعت بظاہر والے خود بینی تصور کرتے ہیں۔

۱۵- بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے (نسخہ مالک رام/۱۶۴)

سایہ سیاہ ہوتا ہے اور ہندوستان بھی سیاہی سے منسوب ہے اس مذاق سے ہندوستان آیا۔ چوں کہ یار کا قرب طالبوں کو بادشاہت ہے اس وجہ سے دیوار کے سائے کو بادشاہت ٹھہرایا۔

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
۱۶- کہ گوشِ گل نم شبنم سے پنبہ آگیں ہے (دیوان/ ۲۱۲)

کان میں روئی ڈالنے سے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ گل کے کان میں یعنی گلوں پر شبنم پڑ کر حسن کو زیادہ کر دیتی ہے اس غرور میں وہ بلبل کی فریاد نہیں سنتے۔ یعنی حسن اپنے غرور سے عشق کی آہ و زاری پر ترس نہیں کھاتا۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
۱۷- بے نیازی تری عادت ہی سہی

عشق حسن سے تنگ آ کر اس کے جور و جفا سہنے کی عادت کر لیتا ہے۔ جب اس کو برداشت پر قائم اور منضبط پاتا ہے تو ناچار ملتا ہی سمجھتا ہے۔ ضبطِ شوق جتانے کو کہا جاتا ہے۔

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
۱۸- تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر (دیوان/ ۹۷)

اس میں یہ مثال ہے آئینے کی حیرت کی صفائی اس کے خبر کا سامان ہے (کذا) جیسا کہ کھڑے پانی کا رنگ بدل جاتا ہے۔

الفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
۱۹- سرو ہے باوصف آزادی گرفتارِ چمن

الفت میں پھنس کے آزادی کا دعویٰ غلط ہے جیسا کہ سرو باوجود اپنی آزادی کی صفت کے چمن کی الفت میں قید ہوا کھڑا ہے۔ اس کو تمثیل کہتے ہیں۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
۲۰- میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا (دیوان/ ۶۴)

اگر دوا کھا کر اچھا ہوتا تو دوا کا احسان ہوتا۔ اب جو دوا نہ کھائی اور اچھا نہ ہوا تو یہ

بات یعنی میرا بیمار ہونا کچھ بُرا نہ ہوا بلکہ اچھا ہوا کہ دوا کے احسان کے بوجھ تلے نہ مرا۔

۲۱۔ تھی وطن میں شان کیا غالب جو ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس جو گلشن میں نہیں

(کہ گلخن میں۔ دیوان/۱۱۶)

باغ میں باغباں کا دستور ہے کہ پودوں کی پاس کی گھانس کو نکال دیتا ہے تاکہ پودوں کو نقصان نہ پہنچے اور باغ سے باہر پھینک دیتا ہے۔ پس جب گھانس وطن یعنی باغ میں تھی جب ہی ایسی بے قدر تھی کہ اس کو نکمی ہونے کے باعث باغ سے نکال کر پھینک دیا تھا۔ اب باغ سے باہر بے اصل سوکھی گھانس کی تو کیا قدر و قیمت ہونی تھی۔ اسی طرح جس انسان کی قدر وطن میں نہ ہو تو پردیس میں بھی نہیں ہوتی۔

۲۲۔ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو (دیوان/۱۴۹)

مالدار کو سفر میں مال کے اندیشے سے نیند نہیں آتی اور جب اتفاقاً راہ میں راہزن لوٹ لیتے ہیں تو مال کی حفاظت کا اندیشہ جاتا رہتا ہے اور بےفکر ہو کر سوتا ہے تو ظریفانہ راہزنوں کو دعا دیتا ہے کہ مال لوٹ کر دل کو اندیشے کی قید سے رہا کیا اور نیند بھر سُلایا۔ مطلب یہ کہ زرداروں کو نیند اور چین نہیں، بے زری میں چین اور آرام ہے۔

۲۳۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا (دیوان/۵۴)

آدمی ایک تو ظاہر ہے دوسرے معنی خدمت گار۔ مراد دوم سے ہے[1]

---

[1] شرح: آدمی لوگ آدمی پیش خدمت یا گھر کے نوکر کو کہتے ہیں۔ وہ تمام گھر کے مشکل کاروبار کہ آقا سے نہ ہو سکیں آسانی سے کر لیتا ہے مگر آقا والے کاروبار انسانیت یعنی علوم و فنون اور صنعت کمالات خدمت گار سے ہونے بہت ہی دشوار ہیں جب ان سے لڑکپن میں نہ ہو سکے جوان ہو کر خدمت گاری کی ذلت میں پڑے۔ مطلب یہ کہ ہر ایک انسان خاص ایک ایک کام کے واسطے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

آگ سے، پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے لاچار ہے (ناچار دیوان/۱۶۹)

جب آگ کو پانی میں ڈالتے ہیں تو بجھتے وقت سوں سوں کی آواز یعنی رونے کی نکلتی ہے یعنی آگ جو اپنے سوز اور دھوئیں سے جہاں کو رلاتی ہے آفت و مصیبت پڑنے کے وقت وہ بھی رو پڑتی ہے۔ اسی طرح دشمن سے مغلوب ہوکر ناچاری میں ہر ایک گریہ وزاری کرتا ہے۔

۲۵- غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مال کا لالچ توقیر کو کھو دیتا ہے، جس طرح کہ باغ میں گل معشوق بنا ہوا تھا۔ جب زر کا لالچ ہوا تو بکنے کے لیے بازار میں آیا۔

۲۶- لپٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی (دیوان/۱۶۲)

پرنیاں ریشمی باریک کپڑا ہے جو آگ کی ذرا سی آنچ سے جل جاتا ہے تو اس صورت میں شعلے کا پرنیاں میں چھپا رہنا بہت مشکل ہے، لیکن اس سے زیادہ محال دل میں غم کی آگ کا چھپانا ہے یعنی جس طرح ریشمی کپڑے میں شعلہ نہیں چھپتا۔ اسی طرح دل میں غم نہیں چھپتا اور پھونک ڈالتا ہے۔

۲۷- رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے (دیوان/۱۶۴)

عمر کی چال بے قراری کے راستے کو کاٹتی ہے، یعنی بے قراری کو طے کرتی ہے، یہ عمر کا جھٹ پٹ گزر جانا بجلی کے کوندھ جانے سے آسانی سے ایسا سمجھ میں آجاتا ہے جیسا کہ جنتری میں سال بھر

(بقیہ پچھلے صفحے سے) پیدا کیا گیا ہے اس سے اپنا کام آسانی سے ہو سکتا ہے اور دوسرے کا کام اس کو دشوار ہے جیسے کہ سرمایہ خرد میں ہے۔ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہ۔ یعنی جو شخص جس کام کے واسطے پیدا کیا گیا ہے وہی اس کے واسطے آسان ہے۔

کا حساب آفتاب کی رفتار سے۔ مطلب یہ کہ جس طرح بجلی بھڑک کر کوندکے ذرا سی دیر میں غائب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تھوڑی سی دیر میں عمر چمک کر جاتی رہتی ہے۔

۲۸- نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے (دیوان/۱۷۷)

دنیا نقد ہے۔ وہ فانی ہے، اور آخرت ادھار ہے، حقیقت میں دونوں بے اعتبار ہیں۔ جو عارف لوگ ہیں وہ دونوں کو کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ خدا کو حاصل کرتے ہیں اور خدا اپنے آپ کو حاصل کرنے سے حاصل ہوتا ہے، یعنی جس نے اپنے نفس کو کما لیا اس نے خدا کو پا لیا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ، یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا پس اس لیے میری عالی ہمت نے دونوں عالم کو بے حقیقت سمجھا اور مجھ سے مجھ کو خرید لیا کیوں کہ مجھ میں یعنی انسان میں ذات الٰہی ہے۔

۲۹- ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے (دیوان/۱۸۷)

ہمارا ہونا ہی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ فنا ہونے والی شے ہے یعنی ہونے ہی سے ہم فنا ہوئے۔ جس طرح انسان اپنی قسم کھا کے آپ مر جاتا ہے۔ گویا آپ ہی نے اپنے آپ کو فنا کیا۔

۳۰- سرگشتگی میں عالم ہستی میں یاس ہے
تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے (دیوان/۱۶۹)

اس قدر پریشانی ہے کہ زندگی کی امید نہیں جب امید نہ رہی تو دل کو بے قراری ہوئی۔ اب دل کے قرار کے واسطے ایک نہ ایک امید رکھنی چاہیے تو ناچار دل کی تسلی کے لیے مرنے کی امید باندھی تاکہ اگر اور امیدیں پوری نہ ہوئیں تو یہ ضرور پوری ہو گی جب کوئی امید پوری نہ ہو تو مرنا یاد کر کے دل کی تسلی کر لینی چاہیے۔

۳۱- مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی (دیوان/۱۹۰)

گردوں یعنی آسمان کو ساقی ٹھہرایا چوں کہ یہ سات ہیں اور ۱ + ۲ + ۴ = سات ہوتے ہیں اس واسطے اس کے سات جام ٹھیرائے چونکہ آسمان اُلٹے پیالے کی صورت ہے اور اُلٹا پیالہ خالی ہوتا ہے کسی کو اس سے قطرہ نہیں ملتا اس واسطے آسمان سے کسی کو عشرت کے قطرے کی امید نہیں کیوں کہ وہ تو خود اوندھے اور خالی پیالے ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
۳۲۔ (دیوان/ ۲۲۱)
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

شریعت تو عشق الٰہی سے بثباتی ہے اور کفر یا بُت پرستی یعنی عشق الٰہی عشق کی طرف یعنی بُت خانے کی طرف کھینچتا ہے اور میں عاشق حق کعبے کو پیچھے چھوڑ کر عشق کے بت خانے کی طرف جا رہا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ عاشقان خدا کعبے اور ایمان کی طرف پیٹھ کرتے ہیں اور بت خانے یعنی دل کی طرف منہ ہوتا ہے۔ وہ اسی گھر میں خدا کو دیکھتے ہیں۔

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
۳۳۔ (دیوان/ ۲۰۰)
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ[1]

سونا سوگند ایک قسم کا خالص سونا ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ سونا قسم ہو گیا ہے۔ مراد اول سے ہے کہ بیداری سے رنگ زرد ہو گیا ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
۳۴۔ (دیوان/ ۹۲)
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مصدر دینا سے جان دی یعنی مر گئے اور دی ہوئی اسم مفعول مشتق ہیں۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
۳۵۔ (دیوان/ ۱۵۰)
دکھتے ہیں آج اس بُتِ نازک بدن کے پاؤں[2]

---

[1] اگر آدمی رات بھر جاگتا رہے تو رنگ زرد ہو جاتا ہے اور سونے کا رنگ بھی زرد ہوتا ہے اس لیے رات کو نیند نہ آنے سے خالص سونے جیسا میرا رنگ ہو گیا۔

[2] اس درجے کے نازک کی نزاکت کی تعریف ہے کہ اگر وہ کسی کے خواب میں بھی آجائے تو اس کے پاؤں اس طرح دکھنے لگ جاتے ہیں جس طرح کسی کے اصلی سفر میں۔

نازک بدنی کا مبالغہ ہے کہ خواب میں آنے سے بھی پاؤں دکھتے ہیں۔

۳۶۔ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شب مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں (دیوان / ۱۴۰)

میرا گھر ایسا اندھیرا ہے کہ اگر اس کے دیواروں کے سوراخ میں روئی کا پھول رکھ دیں تو وہ چاند بن جائے اور اس کی چاندنی سے گھر چاندنا ہو جائے۔ یہ معاملہ ہے کہ سیاہی میں سفیدی زیادہ چمکتی ہے اور تھوڑی سی بھی بہت دکھائی دیتی ہے جیسے کہ تھوڑا سا پانی رات کو بہت اور زیادہ سفید نظر آتا ہے اور کلر زمین ایسی چمکتی ہے کہ پانی نظر آتا ہے۔

۳۷۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

ہم سب سے ملنے جلنے والے آدمی ایسے زندہ ہیں کہ تمام کو دکھائی دے رہے ہیں سب ہم کو پہچانتے ہیں، خضر کی طرح زندہ نہیں کہ آب حیات پی کر لوگوں سے چور بنا پھرتا ہے یعنی چھپا پھرتا ہے، خلاصہ یہ کہ نعمت وہی لطف دیتی ہے جو یاروں کے شامل برتی جائے جیسے کہ پنجابی مقولہ ہے "یاراں نال بہاراں" اور اکیلے اعلیٰ سے اعلیٰ نعمت نہایت بے لطف ہے جیسے کہ مثل ہے "اکیلا روتا بھلا نہ ہنستا"۔

۳۸۔ ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا (دیوان / ۸۰)

واقعہ یہ ہے کہ فزکس یعنی علم طبیعیات کا مسئلہ ہے کہ پانی گرمی پاکر بخارات و بھاپ بن کر اوپر چڑھ جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اجزا میں پھیل کر ہوا جاتا ہے۔ اسی طرح کثرت سے رو کر ضعف آجاتا ہے اور آنسو خشک ہو جاتے ہیں پھر رونے میں آنسو نہیں نکلتے صرف ٹھنڈی آہیں نکلتی ہیں اور وہ جو اندر گرم خون تھا وہ آنکھوں کے رستے آنسو بن کر نکل چکا اس سبب سے

لے اندھیرے کا مبالغہ ۲ے خضر کے آب حیات کا قصہ ہے، روشناس یعنی سب کی جان پہچان سکے، یہ فزکس یعنی علم طبیعی کا مسئلہ ہے کہ پانی بھاپ بشکل ہوا ہو جاتا ہے۔

ٹھنڈے سانس نکلتے ہیں۔ (خواجہ غالب کو تمام علوم میں کمال تھا)

۳۹۔ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
اگر گل ہوں تو گلخن میں اگر خس ہوں تو گلشن میں[1]

گل گلشن میں چاہیئے اور خس یعنی تنکے بھٹی میں۔ یہاں زمانے کے خلاف سے الٹا حال ہے کہ نیکوں کو ذلت اور بدوں کو عزت۔ زمانے کے خلاف کی شکایت۔

۴۰۔ مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا (دیوان/۴۸)

تعمیر سے مراد وجود۔ مضمر بمعنی پوشیدہ و داخل۔ ہیولیٰ بمعنی مجسّم شے۔ دہقان نادانی اور جلدی اور کوشش سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دکان داروں اور اہلِ حرفہ اور سوداگروں وغیرہ کے کاروبار اپنے اختیار میں ہوتے ہیں جس قدر جلدی اور کوشش کریں اسی قدر فائدہ ہے اور کسانوں کی کھیتی اپنے اختیار میں نہیں۔ آسمانی اختیار میں ہے یعنی جب بارش ہوگی تب ہی بودیں گے۔ اور جلدی کرکے تھوڑی سی بوندوں میں بودیں تو بیج بھی جاوے اور فصل بھی۔ اور جب تک کھیتی اچھی طرح نہ پک جائے کاٹ نہیں سکتا، اگر جلدی کاٹ لیوے تو اناج مرجھایا اور سوکھ نکلے۔ علیٰ ہذا القیاس کسان جس قدر جلدی کرے اسی قدر اس کا نقصان ہے۔ پس خونِ گرمِ دہقاں یعنی دہقان کی جلدی اس کے کھلیان پھونکنے کو بجلی کا شعلہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ جلدی انسان کو خراب کرتی ہے کہ تعجیل کار شیاطیں بود۔

۴۱۔ غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا (دیوان/۹۵)

دوست و عزیز کی جدائی کے غم میں بڑی دل چسپ جگہ باغ کی سیر بھی بری لگتی ہے، یہاں تک کہ گلوں کا ہنسنا جو نہایت مرغوبِ دل ہے، مثل رونے کے ناگوار معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] نیک کے واسطے گل اور بد کے لیے خس یعنی تنکا۔

سیر و تماشا بھی یار دل اور دل کی خوشی کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے ورنہ حسرت و افسوس ہے۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا

۴۲- تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا (دیوان/۴۶)

اس میں حرفی صنعت ہے یعنی "بت مشکل پسند" میں بھی دس حرف ہیں اور تسبیح کے شمار میں بھی دس دانے ہوتے ہیں اپنے لقب کے حرفوں کی تعداد اور صفات سے شمار کو پسند کیا یعنی جس طرح آپ ایک ایک وار میں سو سو دل کو اڑا لیتا ہے۔ ورد وظیفے والوں کا دستور ہے کہ جب سو دانے کی پوری تسبیح پھیر لیتے ہیں تو شمار کا ایک دانہ سرکا دیتے ہیں۔ انھیں شمار کے دانوں کے حساب سے بیسیوں تسبیح پھیر لیتے ہیں چوں کہ ایک ایک ہاتھ میں سو سو دل کا اڑا لینا اس کثرت سے خوں ریزی بہت مشکل ہے اس واسطے مشکل پسند کہا اور حسن دلوں کا شکاری ہے، دلوں کو مفت کا مال سمجھتا ہے۔ بقول وزیر:

کہتا ہے دل مرا کفِ رنگیں پہ رکھ کے یار

کیا مال مفت آیا ہے دزدِ حنا کے ہاتھ

اور جو لوگ شمار سبحہ کے معنی تسبیح پھرانے کے لیتے ہیں وہ علاوہ صناعی اور مطلبی غلطی کے ایک بڑی غلطی محاورے کی کرتے ہیں کہ محاورے سبحہ کے ساتھ گردانے اور پھرانے کے ہیں۔ مثلاً: اس کے نام کی سبحہ گردانی کرتا ہوں"۔ تمھارے نام کی تسبیح پھیرتا ہوں صنعت حرفی ہیں ان کا ایک شعر پہلے بھی نصیحتانہ اشعار میں آخر کا آچکا ہے اور تین حرف سے اصطلاح لعن کی اور چار حرف سے لعنت کی عام اشعار میں بہت ہے۔ دیوان ظفر کی رو میں پوری غزل ہے۔ اسی صنعت میں اوصاف کا یہ شعر ہے۔

آرسی میں عکس اپنا دیکھ کر لائے غرور

چار دن کی زندگی میں خود نمائی کر گئے

آرسی میں چار حرف ہیں اس خوبی سے اگلے مصرع میں چار دن کہا۔ چار حرفی آرسی زبان حال سے تارہی ہے کہ اے میرے حرفوں کی تعداد کے موافق تیرا حسن جوانی چار دن کا ہے

اس پر غرور عبث ہے۔

۴۳۔ گرنی تھی ہم پہ، برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر (دیوان/۹۳)

انسان خود ذاتِ باری ہے اور (اس میں) سماگیا ہے اور کوہ طور پر اس نے ذری اپنے نور کی تجلی ڈالی تھی وہ کم ظرفی سے جل گیا۔ پس اس کی تجلیات بلکہ خود اس کی ذات کو اپنے میں سما لینے والا انسان ہی ہے اور کو اس کی ذری سی بھی چمک کی تاب نہیں۔ بقول درد:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

۴۴۔ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم (دیوان/۱۱۱)

آزاد لوگ دنیاوی سامان کے نہ ہونے سے غرض نہیں رکھتے، اگر کچھ دل میں خیال آکر غم ہوتا بھی ہے، اس غم کے گھر کو وہ بجلی کی چمکارے سے روشن کر لیتے ہیں یعنی جانتے ہیں کہ زندگی کا عرصہ بہت قلیل ہے۔ جیسے کہ بجلی کا چمکا۔ پس بجلی کی چمک دیکھ کر زندگی کی ناپائیداری کا خیال کر کے غم کے اندھیرے کو روشن کر لیتے ہیں۔ گویا بجلی ہی ان کے اندھیرے کی روشنی ہے کہ اس کی ناپائیداری سے ان کا غم دور ہوتا ہے۔

۴۵۔ ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ ہم (دیوان/۱۱۱)

"تلاش مال اور مرتبے کا ترک کرنا" نامردی اور ناتوانی اور نادانی سے ہے جس کا نام دل کی تسلی کے لیے قناعت اور توکل رکھ لیا ہے۔ قناعت اور توکل کے بہانے سے ہم مردانہ ہمت کے آسرے کا وبال بن گئے ہیں یعنی قناعت سے کم ہمت اور نامرد بن کر شدت اور نکمے نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ مردانہ ہمت کر کے برابر تلاش اور کوشش کرنی چاہیے۔ کسی پر اپنا بوجھ ڈالنا نامردوں کا کام۔ اور اوروں کا بوجھ اپنے سر پر لینا عالی ہمت مردوں کا کام ہے۔

۴۶- دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے (دیوان/۲۰۵)

انسان کی اصلی غرض دوست یعنی خدا کا حاصل کرنا ہے مگر انسان نے اس اصلی مطلب کو جہالت سے فوت کیا کہ انسانوں کی دشمنی میں اُلجھ گیا۔ اس الجھاؤ اور عداوت و دشمنی میں پڑھ کر دوست کی طلب اور ملاقات سے محروم رہا۔ اور اگر چشم معرفت ہوتی تو دوست کی طلب و تلاش کے سوا اور طرف دھیان نہ کرتا اور کسی کو دشمن نہ جانتا۔ بلکہ دشمن کو بھی دوست ہی جانتا۔ بقول درد :

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ

جب کہ سب چیز میں دوست ہے تو کوئی بھی غیر اور دشمن نہیں۔ بقول ناسخ :

صفحہ ہستی میں صورت ہی نہیں اغیار کی
ہر مرقع میں ہیں تصویریں بس اپنے یار کی

۴۷- ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے (دیوان/۱۶۴)

دوست جو ہمارے پر نامہربان ہے یعنی جور و جفا کرتا رہتا ہے اس میں اس کو ہماری وفاداری کا پورا پورا بھروسا ہے کہ ہمارے ہر جور و جفا بخوشی سہے گا' اس لیے ہم اس کے جور و جفا بخوشی سہتے ہیں کہ شکر ہے اس کو ہماری وفاداری کا پورا بھروسا ہے۔

۴۸- گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے (دیوان/۱۶۷)

جب کہ عام فہم یہ بات ہو گئی کہ جو شخص رازِ عشق رکھتا ہے وہ خاموش رہتا ہے تو خاموشی میں اخفائے راز نہ ہوا بلکہ افشائے راز ہوا۔ اس نازک خیالی سے میں بولتا رہتا ہوں تاکہ کسی کو اخفائے راز کا گمان نہ گزرے۔ پس میرا بات کرنا عام سمجھ کے نزدیک حال کا چھپانا ہے۔ اس وجہ سے میں بولنے اور بات کرنے میں خوش ہوں کہ میرا مطلب سمجھنا بہت مشکل ہے کہ بھید چھپانے کو بولتا رہتا ہوں۔ اس مضمون کی تائید میں انھیں کا یہ شعر ہے :

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے (دیوان/۱۸۵)

مومنؔ: مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
کچھ حال ہی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یعنی خاموشی کی حالت کہہ رہی ہے کہ کچھ رازِ عشق کا اخفا ہے۔

۴۹۔ عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے (دیوان/۲۲۱)

محبوب اس بات میں خوش ہے کہ سوائے عاشق اور معشوق کے کوئی ان کے عشق سے واقف نہ ہو۔ سو یہ بات ہمارے میں ہے کہ ہجر و غم کے ہزار ہا صدمے جھیلتے ہیں پر اس راز کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتے اور سب عاشقوں میں نامی مجنوں گزرا ہے مگر اس سے صدمے کی برداشت نہ ہو سکی، چلّا اٹھا اور جنگلوں دیوانہ ہو کر لیلیٰ لیلیٰ کہہ کے اپنی مٹی اٹھائی اور پردہ نشین لیلیٰ کی خاک اُڑائی۔ اس راز کی پاسداری سے لیلیٰ مجھ کو عشق میں اچھا اور مجنوں کو بُرا کہتی ہے۔ بھید کے چھپانے والے کی بڑی قدر اور ہیبت ہوتی ہے۔

۵۰۔ تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا[1] (دیوان/۹۱)

مذاق اس میں ہے کہ عاشق کو اپنے پُرزے اُڑتے دیکھنا ایک آسان کھیل اور عمدہ تماشا ہے کہ قاتل کی صورت تو دیکھیں گے اور ہاتھ اور تلوار کے مزے لیں گے۔

۵۱۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا[2] (دیوان/۴۴)

خدا نے دنیا اپنی ایک ایسی دل چسپ محفل لگائی ہے کہ جو شے یہاں سے جاتی ہے روتی چلاتی

---

[1] ہم متکلم ہے اور غالب کو غائب جانا ہے مُراد دونوں جگہ غالب سے ہے۔

[2] سب کو پریشانی میں شامل کیا ہے۔

اور پریشان جاتی ہے۔ مرنا اس واسطے کٹھن ہے کہ اس کی بزم دنیا چھوٹتی ہے جیسے ناسخ کا پہلا یہ عارفانہ شعر گزرا۔

طرفہ گل اس باغ میں ہے اور شبنم ہے عجیب
ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ روکر اٹھا

(۴۴)

دوسرا چمن "اشعار محاورات میں" ہے، اس کے آغاز میں مولف نے لکھا ہے:

"ابتدا اردو زبان کی شاہ جہاں شاہ دہلی کے عہد سے ہے اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں یہ مشہور شاعر دہلوی صاحب دیوان مستند استاد ہوئے ہیں جن سے اردو زبان کا زور و شور رہا۔ میر تقی، میرزا رفیع السودا، خواجہ میر درد، ان کے بعد غلام ہمدانی مصحفی انشاء اللہ خاں، قلندر بخش جرأت، پھر بہت سا اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے ظفر کے زمانے تک۔ اردو زبان کو ان مستند اساتذہ صاحب دیوان ابراہیم ذوق، میرزا اسد اللہ غالب، حکیم مومن خاں، شاہ ظفر دہلوی اور امام بخش ناسخ وحیدر علی آتش لکھنوی نے مانجھا ہے اس لیے اشعار محاورات ان مستند اساتذہ کے بہ ترتیب لیے گئے اور چوں کہ اردو زبان دہلی میں لال قلعے کی فصیح تھی۔ خاص کر اس میں شاہزادوں کی بموجب اس کے کہ کلام الملوک ملوک الکلام اس لیے شاہ ظفر کا کلام زیادہ لیا گیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دیوان ظفر در اصل شاہ ظفر کے استاد کامل حضرت ذوق کا ہے کیوں کہ انھوں نے اکثر آپ غزلیں کہہ کے شاہ ظفر کا تخلص ڈال دیا ہے جیسا کہ آب حیات میں مذکور ہے اور باقی غزلیں ان کی اصلاح سے ہیں....."

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا[1]
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا (دیوان/۴۱)

---

[1] موئے آتش دیدہ = آگ کی سینک لگا ہوا بال، مراد زلف کا کنڈل دار بال جو آتشیں رخ کی سینک سے مڑ گیا ہے۔

موے آتش دیدہ کنڈلی دار بال کو کہتے ہیں جیسا کہ ناسخ کے اس شعر سے ثابت ہے:

ہجر میں میرا بدن کاہیدہ ہے
سوزِ غم سے موے آتش دیدہ ہے

اس وجہ سے یہاں موے آتش دیدہ سے مُراد زُلف کے کنڈلی دار بال ہیں جو روے آتشیں کی سینک سے مڑ گئے ہیں۔ ہم زلف کے سودا میں سودائی ہو کر قید میں آئے تو یہاں بھی پاؤں کی زنجیر کنڈلی دار زلف کی صورت ملی - اس لیے ہم یہاں بھی زلف کی زنجیر میں اسیر بے قرار ہیں بقول ظفر:

اور سودا ہوگا افزوں، یاد آئے گی وہ زلف
لاؤ مت آہن گرو زنجیر میرے روبرو

۵۳- نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں[1] جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا (دیوان/۴۷)

نیستاں بمعنی بانسوں کا بیڑ۔ نیستاں کا ریشہ ہونے سے مراد الغوزہ مثل بنسری بن جانا جیسے کہ الغوزے سے نالے کی آواز نکلتی ہے اسی طرح تنکے سے آواز نکلی۔

۵۴- دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں[2] کا (دیوان/۴۷)

فرصت کے لفظ میں یہ خوبی ہے کہ سروِ چراغاں ہمیشہ روشن نہیں ہوتا۔ صرف محرم کے عشرے میں اس کی روشنی کا تماشا ہوا کرتا ہے اور یہ روز غمی کے کہلاتے ہیں اسی طرح ہمارا دل ماتم سرا کا سروِ چراغاں ہے۔ اگر ہمارا یار کسی موقع پر دیکھنا چاہے گا تو دکھلا دیں گے۔

۵۵- نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی[3] ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا میری مژگاں کا (دیوان/۴۸)

---

[1] دانتوں میں تنکا لینا = جان کی پناہ یا امان چاہنا۔ رحم دلانے کو عاجزی کرنا کہ میں تیری کالی گوڑ ہوں۔
[2] سروِ چراغاں = ایک لوہے کا جھاڑ ہوتا ہے جس میں صدہا لوہے کے دیے بنے ہوتے ہیں جن میں تیل بتی ڈالتے ہیں [3] لہو پانی ہونا = سخت مصیبت جھیلنا رنج و غم میں جان کھپانا [4] اصل میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کس کس سے مراد دل، اور جگر ہیں کہ نسواں کے خون سے بنے ہیں۔

۵۶۔ قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں[1] کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا (لڑکوں کا دیوان/۲۱)

اس شعر میں گریہ کا مبالغہ ہے، دیدۂ بینا بمعنی عارف کی آنکھ۔ عارفوں کو ایک دانے میں خرمن اور قطرے میں دریا یعنی جزو میں کل نظر آتا ہے کہ جزو ہی سے بڑھتے بڑھتے اس کا کل بن جاتا ہے۔ یہ شعر ذوق کے اس شعر کے مضمون پر ہے جس کی شرح ذوق کے عارفانہ شعر میں گذری[2]۔

۵۷۔ سرمۂ مفت نظر[3] ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا (دیوان/۷۸)

مفت چیز کا احسان مول کی چیز سے بھاری ہے اور بیش قیمت ہے۔ مذاق یہ ہے جس خریدار کو سرمہ فروش ایک دو سلائی بطور بانگی کے مفت دیتا ہے وہ اس مفت کے احسان میں دب کر کچھ نہ کچھ خرید ہی لیتا ہے۔

۵۸۔ لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج[4]

بیمار دار۔ بیمار کے علاج کرنے والے کو اور ٹہل کرنے والے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کا مرض مسیحا سے بھی نہیں جاتا ثبوت یہ کہ بت پرستوں کو بتوں کے عشق سے ہر چند بڑے بڑے معجزے دکھا کر ہٹایا مگر وہ نہ ہٹے یعنی ان کا مرض عشق نہ گیا بلکہ مریض عشق ہی

(بقیہ پچھلے صفحہ سے) 'میری ہی ہے' مگر تیری مژگاں ہونا چاہیئے اور اس صورت میں شارح کا مفہوم باطل ہو جائے گا۔

[1] لڑکوں کا کھیل = بہت آسان کام سمجھنا، سرسری جاننا

[2] ذوق: دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو جزو میں آتا ہے نظر کل کا تماشا ہم کو

[3] سرمۂ مفت نظر = وہ سرمہ جو سرمہ فروش بانگی کے طور پر ایک دو سلائی لگانے کے واسطے خریدار کو مفت دیتا ہے مراد مفت نعمت [4] کیا علاج = کیا سزا۔

ان کے جان کے دشمن بن گئے یعنی سولی دینے لگے۔ یہ مشکل سے جان بچا کر چوتھے آسمان پر جا چڑھے۔

ذوق: چرخ پر بیٹھا رہا جان بچا کر عیسیٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیمار دل کا

۵۹۔ واحسرتا کہ یار نے کھینچا[1] ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر (دیوان/۹۲)

جب قاتل نے دیکھا کہ میرے قتل سے مقتولوں کو لذت آتی ہے تو قتل ہی چھوڑ دیا ہے یعنی اس کو اپنے شوق سے سروکار نہیں۔ ہماری بے لطفی و محرومی و ایذا سے کار ہے۔ کس لطف سے قاتل کو قتل سے ہٹا کر اپنی قوم کو بچایا ہے۔

۶۰۔ اچھل کے دیکھ نہ چل[2] اس تدرتو اے سرکش
کہ تیرے ساتھ ہے فوارہ سال نشیب و فراز (یہ شعر دیوان غالب میں نہیں ہے)

جس طرح فوارے کا پانی اوپر چڑھ کے نیچے آ پڑتا ہے اسی طرح سرکش اچھل کے سر کے بل گر جاتا ہے۔

۶۱۔ ایسا آساں نہیں لہو رونا[3]
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں (دیوان/۱۱۳)

رونے کے واسطے دل میں طاقت اور جگر میں حال یعنی وجد کی طاقت ہونی چاہیئے۔ جب یہ نہ ہوں تو رویا نہیں جاتا یعنی اب ایسے ناتواں ہو گئے ہیں کہ رونے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

۶۲۔ سر کھجاتا[4] ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں (دیوان/۱۲۰)

---

[1] ہاتھ کھینچنا = ہٹ جانا، بند ہو جانا [2] اچھل کر چلنا = اپنی بنیاد سے بڑھ کر چلنا، اپنی حیثیت سے بڑھ کر چلنا [3] لہو رونا = نہایت زار زار رونا، اندوہ وغم میں ایسا رونا کہ آنسو ٹپکنے لگیں۔
[4] سر کھجانا = پٹنے کو جی چاہنا، زخمی ہونے کی خواہش کرنا

عشق کے پتھر کی چوٹ میں وہ مزا ہے کہ بیان نہیں کیا جاتا۔ اگر اچھا ہو جاتا ہے تو پھر چوٹ کھانا چاہتا ہے۔

۶۳۔ کہتے ہیں جیتے ہیں[1] امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں (دیوان/۱۲۲)

زندگی قائم رکھنے کے لیے امید کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ہم زندگی سے بیزار ہیں۔ اس کے لیے امیدوں کی انتظاری کے عذاب کیوں دیکھیں۔ الانتظار اشدّ مِنَ الموت۔

۶۴۔ دل نہ دوں اپنا کبھی میں تیرے کافر ہاتھ میں
تو کلام اللہ[2] بھی گر آئے لے کر ہاتھ میں (یہ شعر دیوان غالب میں نہیں)

تو دل کو لے کر صاف مکر جانے والا ہے اس لیے قسم و سوگند سے تیرا اعتبار نہیں۔ سنگدلی کی رو سے کافر کہا اور کافر کو قرآن پر ایمان نہیں ہوتا جب اس کو اس پر خود ایمان نہ ہو تو دوسرا اس کی اس قسم پر جس پر اسے خود ایمان نہیں کیوں کر ایمان لاوے۔

۶۵۔ رَو میں ہے[3] رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (دیوان/۱۲۵)

عمر کا گھوڑا سرپٹ جا رہا ہے نہ تو سوار کے ہاتھ میں باگ ہے اور نہ پاؤں رکاب میں جس سے روکے یعنی کوئی اختیار نہیں ہے منزل موت پر ہی جا کر تھمے گا یعنی ٹھہرے گا۔

۶۶۔ جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد[4] نہیں (دیوان/۱۳۳)

مسلمانوں میں رسم ہے کہ جب مہمان یا کوئی سفر سے آتا ہے تو مرحبا کہتے ہیں اور جب جاتا ہے تو خیر باد کہتے ہیں۔ یہاں آنے کی خوشی اور نہ گئے کا غم۔

---

[1] امید پر جینا تنگ دستی میں فراغت اور غمی میں خوشی کی امید پر دل کی تسلی کرنا۔ تسلی دینے کے موقع پر بولتے ہیں [2] کلام اللہ ہاتھ میں لے کر آنا = قرآن شریف کی قسم کھانا [3] رَو میں ہونا = گھوڑے کا سرپٹ دوڑنا [4] خیر باد = کلمہ دعائیہ کسی عزیز کی رخصت کے وقت کہتے ہیں۔

۶۷-
تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں[1] (دیوان/۱۲۳)

جب پاؤں کو حنا لگاتے ہیں تو چلتے پھرتے نہیں ایک جگہ ٹکے بیٹھے رہتے ہیں اس واسطے پا بہ حنا کے معنی ٹکے ہوئے کے ہیں یعنی عمر ایسی تیز رفتار ہے کہ اس کے مقابل میں بجلی کو قیام معلوم ہوتا ہے یعنی بجلی تو کچھ دکھلائی بھی دیتی ہے یہ دکھلائی بھی نہیں دیتی اور جھٹ پٹ گذر جاتی ہے۔

۶۸-
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے[2] چلا کیے (دیوان/۱۷۴)

عاشقانِ خدا پر ہمیشہ تہمتیں اور جور و جفا ہوتے چلے آئے ہیں دیکھو حضرت زکریا پیغمبر کو آرے سے چروایا، منصور کو سولی چڑھایا، شمس تبریز کی کھال اتروائی۔

۶۹-
ہاں بھلا کر[3] ترا بھلا ہوگا
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے[4] (دیوان/۸۲)

اپنی بہبودی کی دعا مانگنا اور لوگوں سے منگوانا کچھ فائدہ نہیں، فائدہ مند اگر ہے تو یہی بات ہے کہ اگر تو اپنا بھلا چاہے تو کسی کا بھلا کر اس کے عوض میں ضرور تیرا بھلا ہوگا۔

۷۰-
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے[5] (دیوان/۱۸۷)

اس شعر کا مطلب بھی وہی ہے جو پیچھے ۶۸ ویں شعر میں سر پر آرے چلنے کا ہے۔

---

[1] باندھنا = شعر میں لانا، نظم میں لانا، کسی سے تشبیہہ دینا [2] آرے چلنا = آفتیں مصیبتیں جھیلنا، زخم صدمے رنج اٹھانے [3] کر بھلا ہو بھلا = ہر ایک سے بھلائی اور نیکی کرنے کی نصیحت پر بولتے ہیں۔

[4] اصل میں دوسرا مصرع غلط لکھا گیا ہے، یوں ہونا چاہیئے:

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی دعا کیا ہے

[5] قلم ہونا = کٹنا۔

۷۱۔ خستگی کا تم سے کیا شکوہ کریں (کیا شکوہ کریں)
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے[1] (نسخہ مالک رام/ ۲۰۰)

سیاہ رنگ آدمی کی برائی میں کہا کرتے ہیں کہ جیسے یہ اوپر سے سیاہ ہے ویسا ہی اندر سے ہے پس آسمان اندر باہر سے سیاہ ہمارا دشمن ہے جس نے ہم کو تم سے زخمی کرایا۔

۷۲۔ اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے[2]
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے (دیوان/ ۲۰۹)

جب اس عزیز نے مجھے اپنے پاؤں دبانے کی خدمت کو کہا تو مجھے شادی مرگ ہو گئی کہ میرے کم بخت ہاتھ پاؤں پھول گئے، اگر مراد کو پہنچا تو بد قسمتی دیکھو کہ مراد ہاتھ آنے سے رہ گئی۔

۷۳۔ اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے[3] (دیوان/ ۲۲۵)

سایہ سیاہ ہوتا ہے اور جس پر وقت پڑتا ہے وہ بھی رنج و غم سے سیاہ پڑ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کا پرتو آپڑ جائے تو ہم بھی روشن ہو جائیں۔

۷۴۔ واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی[4] (دیوان/ ۲۳۶)

واعظ، زاہد وغیرہ بہشتی شراب طہور کی تعریف ایسے مبالغے سے کرتے ہیں کہ سن کر منھ میں پانی بھر آتا ہے مگر ہے خیالی پلاؤ۔

اس طرح اس کتاب میں (۷۴) اشعار کی شرح ملتی ہے، بعض اشعار کا مطلب شارح نے غلط بھی بیان کیا ہے اور بعض جگہ سیدھا اور سامنے کا مفہوم چھوڑ کر دور از قیاس مطلب پیدا کیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ شرح ابیات دلچسپ ہے اور اس سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ خود غالب کے ہم عصر اور قریب العہد لوگ اس کے کلام کو کس طرح سمجھتے تھے اور لفظی و معنوی خوبیوں کی کنہ کو کہاں تک پہنچتے تھے۔

---

[1] ہتھکنڈے = چالاکیاں، داؤ گھات فند و فریب [2] ہاتھ پاؤں پھول جانا = خوشی یا خوف کے مارے ہاتھ پاؤں کا بیکار ہو جانا۔ ہاتھ پاؤں کا نہ چلنا غالب کا دوسرا تخلص اسد ہے [3] وقت پڑنا، مصیبت پڑنا [4] کیا بات ہے، طنزاً کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ کیا کہنے۔ کیا خوب واہ واہ مراد یہ کہ کچھ بھی نہیں، دھوکے کی بات ہے، فرضی اور خیالی پلاؤ ہے۔

اسی مصنف کے قلم سے

۱- میر کی آپ بیتی:

ناخدائے سخن میر تقی میر کی فارسی خود نوشت کا سلیس اور مستند اردو ترجمہ ضروری حواشی اور تصریحات کے ساتھ۔ (طبع ثانی)

۲- دید و دریافت:

"دس تنقیدی، تخلیقی، تحقیقی و ادبی مضمونوں اور تبصروں کا مجموعہ۔ بیشتر حصہ قابل دید۔ زبان صاف ستھری سلیس و دلکش، انداز بیان شریفانہ۔ آنچ سطر سطر سے نمایاں.....؟"

(عبدالماجد دریابادی)

صفحات ۲۵۴ قیمت ۳/۷۵

۳- میر تقی میر: احوال ثلاثہ

دہلی کالج اردو میگزین کا شمارہ خصوصی بیاد میر۔ جس میں اعلیٰ درجے کی تنقیدی اور تحقیقی مضامین یکجا ملیں گے۔

صفحات ۲۵۴ قیمت ۳/۷۵

۴- طبقات الشعراء:

قدرت اللہ شوق کا تذکرہ، جامع مقدمے کے ساتھ

صفحات ۷۸۸ قیمت -/۱۶

۵ - تین تذکرے :

ہندستانی شعراے اردو و فارسی کے حالات پر مشتمل تین کمیاب تذکروں کی تلخیص جو تاریخ ادب اردو کے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجمع الانتخاب (شاہ محمد کمال) طبقات الشعراء (قدرت اللہ شوق) گل رعنا (لچھمی نراین شفیق)

صفحات ۳۴۸ قیمت -/۷

۶ - مقالات الشعراء :

مولفہ قیام الدین حیرت اکبرآبادی، جس کا دنیا بھر میں صرف ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

صفحات ۱۱۰ قیمت -/۵

۷ - کلیات مصحفی :

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی کے جملہ کلام نظم و نثر کا مجموعہ، حسن طباعت، صحت اور جامعیت کے ساتھ۔ جلد اول و دوم شائع ہو چکی ہیں۔

قیمت جلد اول -/۷۵ جلد دوم ۶/۷۵

۸ - دراسات :

ادبیات اردو و فارسی کے اہم موضوعات پر عالمانہ مضامین کا مجموعہ جن کا مطالعہ ادب کے ہر سنجیدہ قاری کے لیے ضروری ہے۔ (زیر طبع)